حقوق نسواں: چند زمینی حقائق

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے پائے جانے والے تاثرات میں مسلم معاشروں میں عورت کا مقام و کردار ایک مرکزی موضوع کا مقام اختیار کر گیا ہے اور بعض غلط العام تاثرات کی تکرار نے بہت سے مسلم اہل قلم کو مدافعانہ انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ کسی بھی عصری مسئلہ کا علمی جائزہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ کی نوعیت، اس کے اسباب اور اس سے نکلنے والے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے معروضی طور پر یہ دیکھا جائے کہ جس بنیاد پر دلائل کی عمارت تعمیر کی گئی ہے کیا وہ درست ہے یا اس کی ٹیڑھ پوری عمارت کے ایک جانب جھک جانے کا سبب ہے اور کیا واقعی مقصود ایک ٹیڑھی عمارت ہے یا سیدھی تعمیر۔

تقابلی مطالعوں میں عموماً ایک محقق کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس مواد کو یکجا کر دے جو تحقیقی مفروضہ سے مطابقت رکھتا ہو اور منطقی طور پر وہ نتیجہ حاصل کر لے جو پہلے قیاس کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ اکثر مغربی تحریرات کا آغاز مسلم دنیا میں پائی جانے والی چند بے ضابطگیوں سے ہوتا ہے جنہیں عموم کا مقام دے کر وہ نتیجہ حاصل کر لیا جاتا ہے جس کو مستحکم کرنے کے لیے مواد جمع کیا گیا تھا۔ مجھے اس امر کا پورا احساس ہے کہ کوئی انسان جو کسی معاشرہ اور کسی علمی روایت سے وابستہ ہو مکمل طور پر اپنے آپ کو اپنے ثقافتی ماحول سے آزاد نہیں کر سکتا لیکن اگر ایک محقق کو اپنی محدودیت اور اپنے تصورات کا پورا ادراک ہو اور ساتھ ہی وہ دیگر نظریات کو عادلانہ نظر سے دیکھے جس کا حکم قرآن کریم نے شہادت کے حوالہ سے دیا ہے کہ چاہے وہ شہادت ایک فرد کے خونی رشتہ دار ہی سے تعلق رکھتی ہو، شہادت حق ہی ہو اور اس میں رشتہ کا تعصب نہ آنے پائے۔ چنانچہ علمی جائزہ میں

بھی اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ ایک مسلمان محقق اسلامی نظام حیات کی حقانیت پر ایمان رکھتا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور دیگر تصورات کو معروضی طور پر ایک کھلے ذہن کے ساتھ اور پہلے سے تصور کردہ مفروضوں سے نکل کر جائزہ لینے کے بعد ایک قول فیصل تک پہنچے۔

اس بنیادی اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو عصر حاضر میں مغربی فکر اور مغرب زدہ مفکرین جن امور پر اپنی توجہ مرتکز کرتے ہیں انھیں اسلام میں خواتین کے حقوق خصوصی دلچسپی کا باعث نظر آتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ خود مسلم اہل فکر نے اس موضوع پر یا تو فقہی نقطۂ نظر سے فقہی احکام کی تشریح کرتے ہوئے عورت اور مرد یا شوہر اور بیوی کے حقوق پر سیر حاصل بحث کی ہے یا بعض اختلافی مسائل میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے قانون اور فقہی آراء کا دفاع کیا ہے۔ چنانچہ حدود اور قصاص و دیت کے معاملات میں ایک عورت کی شہادت کی حیثیت کیا ہوگی، وراثت میں تقسیم کا جو تناسب اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے اس پر کوئی ''نظر ثانی'' ہوگی یا نہیں۔ ایک شادی شدہ شخص کو دوسری شادی کرنے کا اختیار ہے یا نہیں اور ریاست اس سلسلے میں کیا قدغن لگا سکتی ہے وہ موضوعات ہیں جو توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

اسلامی قانون کے حوالہ سے بحث کرتے وقت عموماً جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ اکثر مغربی جامعات سے فارغ مسلم مفکرین مغربی فلسفۂ قانون کے مطالعہ اور اس کے بنیادی مفروضوں پر ایمان لانے کے بعد اسلامی فقہ اور قانون کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ چونکہ فکری بنیاد مغربی فلسفۂ قانون ہوتا ہے، اس لیے بار بار وہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں جو نہ تو نئے ہیں اور نہ منطقی طور پر صحت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قانون جو ساتویں صدی عیسوی میں یا نویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا آخر کس طرح اکیسویں صدی کے تغیر شدہ ماحول و حالات میں قابل عمل ہو سکتا ہے یا یہ کہ قرآن کے احکامات جو خواتین سے متعلق ہوں یا مردوں سے یا معاشرہ کے مسائل سے، آج کس طرح نافذ ہو سکتے ہیں جبکہ ہم ''بدوی'' معاشرہ سے آگے نکل چکے ہیں!

خواتین کی قانونی شہادت، وراثت میں تناسب، تعلیم کا حصول، گھر میں فیصلہ کن معاملات

میں مقام، سیاسی کردار، معاشی میدان میں عمل دخل، فوج اور پولیس میں یکساں نمائندگی، نکاح میں مرد کی طرح ایک سے زائد شوہروں سے زواج قائم کرنا، نماز میں امامت اور جمعہ کا خطبہ دینا وغیرہ وہ مسائل ہیں جن پر اس انداز سے بات کی جاتی ہے گویا یہ مسائل آچانک دریافت کرلیے گئے ہیں اور شارع اعظم اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کے علم میں ان کا کہیں آس پاس بھی سراغ نہیں پایا جاتا تھا ان مسائل سے لاعلمی میں ایک شریعت ہمیں حوالے کردی گئی اور اب چونکہ یہ مسائل یکا یک دریافت ہوگئے ہیں اس لیے وہ شریعت جو ان سے لاعلمی کی بنا پر بنی تھی خود بخود اپنی قانونی قوت کھوبیٹھی ہے!

علمی اور معروضی تحقیقی حکمت عملی کا بنیادی مطالبہ ہے کہ پہلے یہ بات طے کرلی جائے کہ شریعت ہے کیا؟ کیا یہ ایک مردانہ ذہن کے پیدا کردہ تصورات اور حدود و قیود پر مبنی ہے یا اسے خالق کائنات اور صانعِ انسان نے انسان اور انسانی معاشرہ کی ضروریات، مستقبل کے مطالبات اور ضروریات کے پیش نظر نازل کیا ہے؟ اگر شریعت زمان و مکان کی قید میں ہے تو لازماً اسے تغیر و تبدیلی سے گزرنا ہوگا لیکن اگر شریعت زمان و مکان کی قید سے آزاد اُن آفاقی اصولوں پر مبنی ہے جن پر انسانی خمیر کی تعمیر کی گئی ہے تو اس میں آفاقیت ہوگی اور تبدیلیٔ زمان و مکان سے اس کی قانونی قوت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوسکتی۔

مرد اور عورت سے متعلق جو ہدایت نامہ قرآن کریم کی شکل میں اور اس کا عملی نمونہ حیات مبارکہ سید الانبیاء خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں ہمارے سامنے رکھا گیا ہے ان دونوں میں عدم تغیر، آفاقیت اور عالمگیریت کو اپنی مکمل شکل میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس بنا پر قرآن کریم نے سنت کو تشریعی مقام دیا ہے۔ سنت مدینہ اور مکہ کی زمانی و مکانی قید سے آزاد ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ محض اخلاقی نصائح تک محدود نہیں ہے یہ حدود کے اجراء، بین الاقوامی معاہدات، سفراء کے تقرر، قاضیوں اور مفتیوں کی نامزدگی، زکوٰۃ کے نصاب، مرتدین کے خلاف قتال، معاندین زکوٰۃ کی سرکوبی، غرض ان تمام معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو منصب نبوت کے فرائض میں شامل تھے۔

بعض سادہ لوح افراد قرآن فہمی کے دعووں کے ساتھ جب یہ بات کہتے ہیں کہ قرآن میں تو رجم کا ذکر نہیں پایا جاتا تو یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن کریم شارع اعظم کو حکماً یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ تحلیل وتحریم کریں نتیجتاً ان کے تحکیم کردہ معاملات کو حتمی مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ ''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس رسول نبی امّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے <u>ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے،</u> اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔'' (الاعراف ۷:۱۵۷) یہاں پر نشان زدہ حصہ براہ راست رسول کو تحریم وتحلیل کا اختیار دیتا ہے۔

اس بنا پر کہا گیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ اللہ کے فیصلے کی طرح ہے اور جو اس فیصلہ کو قرآن کے احکامات سے الگ سمجھتا ہے اس کا مقام ومرتبہ ایمان سے گرا ہوا ہے۔ ایمان کی شرائط میں سے یہ شرط قرآن کریم خود بیان کرتا ہے کہ جب تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فیصلہ کو کشادہ دلی کے ساتھ بلا کسی تردد وتعمل کے نہ مانا جائے اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہوسکتا ہے ''نہیں، (اے محمدؐ) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بہ سر تسلیم کرلیں'' (النساء ۴:۶۵) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ سبحانہ کی اطاعت قرار دیتے ہوئے فرقان حکیم فرماتا ہے ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے'' (النساء ۴:۸۰) اس سلسلے میں حرفِ آخر وہ فرامین ہیں جو یہ کہتے ہیں ''مومنو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو'' (محمد ۴۷:۳۳) مزید یہ کہ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں'' (النساء ۴:۶۱)

اس ضمنی توضیح سے قطع نظر جو بات بلاجھجک کہنے کی ضرورت ہے وہ بہت آسان ہے: اولاً اسلام اپنے تصور عدل کی بنا پر مرد اور عورت دونوں کے حوالہ سے جو ہدایات دیتا ہے ان کی بنیاد جنسی تفریق نہیں ہے جبکہ مغربی اور مشرقی فکر چاہے وہ مذہبی مصادر میں ہو یا معاشرتی علوم میں اس کی بنیاد جنس (Gender) کی تفریق (Discrimination) پر ہے۔ چنانچہ اسلام نے جو حق خواتین کو ساتویں صدی عیسوی میں دیا کہ وہ ریاستی امور میں اپنی رائے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر دیں (حضرت عثمان کی خلافت کے انتخاب کے موقع پر مدینہ کے ہر گھر کی خواتین سے ان کی رائے سرکاری طور پر لی گئی) وہ حق یورپ میں ۱۸۹۲ء میں صرف اصولی طور پر تسلیم کیا گیا جبکہ اس پر عمل بیسویں صدی میں ہوا۔

آج بھی مغرب اور مشرق میں خواتین کاغذی حد تک تو بعض حقوق رکھتی ہیں لیکن زمینی حقائق اس سے متضاد صورتِ حال پیش کرتے ہیں۔

اسلامی نظام حیات کا بنیادی نکتہ عدل ہے۔ عدل اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ایک فرد پر اس کی برداشت اور استعداد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اس کی وسعت کے لحاظ سے اس کی جوابدہی ہو، قرآنی اصول کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ ''لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا'' اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ (البقرہ ۲:۲۸۶)

چونکہ اسلام ایک مہذب معاشرہ کے قیام کے لیے خاندان کو بنیادی ادارہ قرار دیتا ہے اور مذاہب عالم کے تمام تصوراتِ ''تقویٰ و پاکبازی'' کے برخلاف رشتہ ازدواج اور شوہر اور بیوی کے صحت مندانہ اخلاقی تعلق کو تقویٰ اور ایمان کی علامت سمجھتا ہے اس بنا پر عدل کا مطالبہ ہے کہ خواتین کی سیاسی، معاشی، معاشرتی سرگرمیوں کو خاندان کے تناظر میں دیکھتے ہوئے شریعت کے بنیادی مقاصد اور ''مصلحہ'' کو سامنے رکھتے ہوئے ایک عادلانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ اسلام میں شادی کا مقصد ایک ''کماؤ بیوی'' کا حصول نہیں ہے بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کی معمار اور گھر کے اندر سکون، رحمت اور مودّت کا ماحول فراہم کرنے والی بیوی کا حصول ہے۔

اسلام کا تصورِ اجتماعیت اس کے عدلِ اجتماعی سے منطقی طور پر وابستہ و پیوستہ ہے اور یہ تصور مغربی اور مشرقی تصورِ انفرادیت کی مکمل ضد ہے۔ اس میں فرد کو جائز قانونی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مقام کا تحفظ دیتے ہوئے معاشرتی رشتے میں جوڑا گیا ہے جبکہ دیگر نظاموں میں، وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، فرد کو عبادات میں محض اپنے خدا سے رشتہ جوڑنے کا تصور اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی تصورِ عبادت یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب God اور بندے کے درمیان ایک نجی (Private) اور ذاتی (Personal) رشتہ ہے۔ اسلام اس کی تردید کرتے ہوئے حکم دیتا ہے کہ نماز جماعت کی شکل میں قائم کرو اور اجتماعی طور پر نہ صرف نماز بلکہ صیام، حج اور زکوٰۃ کو ادا کرو۔ قرآن کریم ان عبادات کے لیے ریاست کو ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ ان کے قیام اور تحفظ کے لیے اپنی قوت نافذہ کا استعمال کرے۔ یہ بنیادی نظریاتی فرق اگر سامنے نہ رکھا جائے تو پھر اہل علم بھی اس دوڑ میں لگ جاتے ہیں کہ مغرب یا مشرق عورت کو کون سے ''انفرادی حق'' دیتا ہے اور مقابلتاً اسلام کون سے ایسے حقوق دیتا ہے۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انفرادی حقوق کی دوڑ میں کون کس سے آگے ہے، مسئلہ یہ ہے کہ عدل کس بات کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا یہ عدل ہوگا کہ ایک خاتون سے یہ کہا جائے کہ وہ اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرے، ایمان کی تکمیل کے لیے شادی کرے اور اپنی خاندانی ذمہ داریوں کو جو وہ ایک عقد (Public Contract) کے ذریعہ اختیار کرتی ہے پوری ذمہ داری سے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک کم از کم ۸ گھنٹے ایک معاشی کارکن کے طور پر کام کرے اور جب گھر واپس آئے تو پھر اپنے خاندانی وظائف میں مصروف ہو جائے اور اس بات پر فخر کرے کہ وہ ''مرد کے شانہ بہ شانہ'' ''معاشی دوڑ'' میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے! چاہے اسے اس دوڑ کے لیے اپنے اعصابی تناؤ کو قابو میں رکھنے کے لیے صبح شام ادویات کا استعمال کرنا پڑے، ہر روز کام پر جانے کے لیے دو گھنٹے سخت ہجوم میں ٹیکسی، بس یا اپنی ذاتی گاڑی میں سفر کرنا پڑے اور دفتر میں Sexploitation کا نشانہ بننا پڑے، لیکن وہ یہ سب کچھ اس لیے کرے کہ مغربی اور مشرقی تہذیب ایک Working

Lady کو زیادہ Productive کہتی ہے! اگر معروضی طور پر صرف اس آمدنی اور اس خرچ کا ایک میزانیہ تیار کرلیا جائے جو ایک Working Lady اپنی ''دفتری ضرورت'' کے طور پر ذاتی تزئین پر خرچ کرتی ہے تو ''معاشی ترقی'' کے غبارہ سے ہوا نکل جائے گی اندازہ ہو جائے گا کہ جو آمدنی گھر لائی جارہی ہے اور جس کا تذکرہ بطور ''دو تنخواہوں'' کے ہر صحافیانہ تحریر میں پایا جاتا ہے وہ اصلاً کتنی آمدنی ہے۔

مسئلہ آسان ہے مغرب و مشرق کا ذہنی سانچہ جنسی تقسیم اور استحصال پر مبنی ہے مغرب کی پوری تہذیب میں، جواب مشرق میں بھی عام ہے، عورت ایک ''شے'' (Comodity) سے زیادہ مقام نہیں رکھتی اور وہ بھی ایسی شے جسے exploit کر کے ایک مردانہ معاشرہ اپنے مقاصد حاصل کرے۔ اس کے برخلاف اسلامی شریعت کی بنیاد عدل کے اصول پر ہے جو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کسی فرد پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اور اسے اس کی ذاتی حیثیت میں اور اجتماعی حیثیت میں یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسلم اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی شریعت کے آفاقی پہلو کو اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کو جو عدل اجتماعی پر مبنی ہو مرکزِ گفتگو بناتے ہوئے یہ جائزہ لیں کہ اطلاقی سطح پر یہ اصول کہاں تک مسلم معاشروں میں پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ مغربی معاشرے میں عورت کا استحصال، اس کی عصمت و عفت پر حملے، اس کے حقوق کی پامالی کی داستان ایک اذیت ناک کہانی ہے لیکن مسئلہ کا حل محض یہ کہہ کر نہیں ہوسکتا کہ مغرب خواتین کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ ہمیں خود اپنے معاشروں میں ہونے والے مظالم کو ختم کرنا ہوگا جن کی بنیاد وہ جاگیردارانہ ذہن ہے، جس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ کوئی فرد جاگیردار ہی ہو، یہ ایک ذہنیت ہے جو ایک مزدور میں بھی اتنی ہی شدت سے پائی جاسکتی ہے جتنی ایک لاکھوں ایکڑ کے مالک وڈیرے یا سردار میں پائی جاتی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں دین سے ناواقفیت اور دین کے نام پر دو انتہاؤں کا پایا جانا بھی ایک بڑا

مسئلہ ہے کہ ایک جانب ایسی شدت پیدا کرتی ہے کہ ایک خاتون اپنے گھر میں اجنبی اور ایک کمرے میں مقید ہو کر رہ جائے اور وہ صرف شوہر اور حقیقی اولاد کے ساتھ تو بات چیت کر سکے بلا تکلف کھانے میں شریک ہو سکے لیکن ان کے علاوہ اقربا اور رشتہ داروں سے مکمل قطع رحمی پر مجبور کر دی جائے اور دوسری طرف وہ انتہا بھی ہے کہ حجاب کو محض نگاہ تک محدود کر دیا جائے اور جسم کی عریانی کو معاشرتی ضرورت قرار دے دیا جائے۔ ہمیں ان دونوں انتہاؤں سے نکلنا ہوگا اور مدینہ منورہ کے معاشرے میں صحابیات رضوان اللہ علیہن کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی اور اجتماعی اخلاقیات کے اصولوں کی روشنی میں ایک نیا معاشرہ تعمیر کرنا ہوگا۔ وہ معاشرہ جو قرآن و سنت کے بنیادی اصولوں شرم وحیاء، عفت وعصمت، پاکبازی اور تقویٰ کو عملی زندگی میں ڈھال کر پیش کر سکے۔

اس سلسلہ میں تعلیمی حکمتِ عملی، معاشرتی رسوم ورواج کی تبدیلی، اور سب سے بڑھ کر افراط وتفریط والے ذہن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری دیانت اور نفس کے تجزیہ و احتساب کے ساتھ اپنے معاملات کو شریعت کے دائرہ میں لانا ہوگا۔

شریعت کا دائرہ نہ قیدو بند پر مبنی ہے نہ مادر پدر آزادی پر۔ یہ وہ حدود ہیں جو معروف پر مبنی ہیں۔ یہ معروف وہ ہے جو خالق کائنات نے خود متعین کیا ہے، یہ معاشرتی تبدیلی و ارتقاء کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ قرآن وسنت کی طرح سے آفاقیت اور عالمگیریت کا حامل ہے۔ اگر گفتگو معروف ہو، اگر معاشرت معروف ہو، اگر مہر معروف ہو، اگر رخصتی بھی معروف ہو، اگر معیشت معروف ہو تو پھر عدل کا قائم ہونا ایک منطقی عمل ہے۔

اس قیامِ عدل کے لیے راستہ صرف ایک ہے قرآن وسنت سے براہِ راست تعلق، اس کی تعلیمات واحکامات کا کسی حیل و حجت کے بغیر اور مغرب ومشرق کی فکری غلامی سے آزادی کے ساتھ اس کا نفاذ۔

اسلامی شریعت کی بنیاد نہ جنس کی تفریق ہے نہ رنگ ونسل اور زبان کی تفریق۔ یہ آفاقی اور عالمی حیثیت کے اصولوں پر مبنی وہ شریعت ہے جو قیامت تک کے لیے اصولِ حکمرانی فراہم کرتی

ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ کسی متنفس کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ یہ تمام انسانوں کے لیے یکساں حقوق کی علمبردار اور ان کے عملی نفاذ کی مثال پیش کرتی ہے۔ یہ انسان کو وقار، عزت، اکرام اور معاشرتی وجود سے نوازتی ہے یہ محض مسلم معاشرہ میں نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اس پر عمل کیا جائے گا ایک صحت مند معاشرہ کو وجود میں لائے گی۔ یہی سبب ہے کہ یورپ وامریکہ کے وہ بے شمار متلاشیانِ حق جو اپنے معاشروں کے ظلم واستحصال سے بیزار ہیں یہ جاننے کے باوجود کہ یہ زرین اصولِ شریعت بہت سے مسلم ممالک میں بھی ابھی تک اجنبی ہیں اور مسلم ممالک کے غلام ذہن رکھنے والے فرمانروا ان اصولوں کے مفید اور قابل عمل ہونے کا شعور نہیں رکھتے، یہ متلاشی حق بادِ مخالف کے باوجود اسلام کے حق کو اسلام کی سچائی کو، اسلام کے اس دور میں قابلِ عمل ہونے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ کامیابی اسلام کی کامیابی ہے اس میں مسلمانوں کی اپنی معاشرتی مثال کا کوئی دخل نہیں۔ اگر مسلمانوں کے معاشرے میں بھی اسلام کو وہ مقام حاصل ہو جائے جو ان متلاشیانِ حق کے دلوں میں اسلام کو حاصل ہے تو پھر پوری انسانیت کو اس عدل کو دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے جو قیامت تک کے لیے صرف اور صرف حق وصداقت ہے اور انسانیت کو معراج پر لے جانے کا واحد راستہ ہے۔

— O —

''مغرب اور اسلام'' کا یہ خصوصی شمارہ علمی مکالمے کے اُس خاص موضوع کا احاطہ کرتا ہے جو اس وقت مغربی دنیا اور مسلم دنیا میں یکساں دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے یعنی مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں عورت کی حیثیت اور مغربی عورت کی اسلام کی طرف رغبت کے مظاہر کا جائزہ۔ اس موضوع پر جناب ثروت جمال اصمعی کا حاصلِ تحقیق یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔